اقبال اور حریت انسانی

سلمیٰ صدیقی

علامہ اقبال نے برصغیر کی غلامی کے ایام میں، جب انگریز کی تہذیبی اور استعماری یلغار عروج پر تھی، آنکھ کھولی۔ اقبال اُن مسلم مفکرین میں سے ہیں جنہیں اس صدی کے آغاز ہی میں مغربی اور سیاسی صورتحال اور استعماری رویوں کا تنقیدی اور غائر مطالعہ کا بھرپور موقع ملا۔ اس مطالعہ کے بعد انہوں نے نا صرف برصغیر بلکہ پورے مشرق کے زوال اور اس کے مصائب کا سرچشمہ مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کو قرار دیا جس نے مشرق کی روح کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> اقبال نے اصولی طور پر مغربی استعمار کی مخالفت کو اپنا عقیدہ یا لائحہ عمل فقط اس لیے بنایا کہ وہ جان گئے تھے کہ مغرب مشرق کے لیے خدائی کرنے کا دعویدار بن چکا ہے جب کہ خود مغرب نے اپنے لیے اقتدار اور زر اندوزی کے بتوں کو بطور خدا کے تجویز کر لیا ہے۔ ان حالات میں مغربی دین و دانش کے پس منظر میں ہوس کی حیلہ گری کے سوا کچھ بھی نہیں۔[1]

یہی وجہ ہے کہ اپنے فکری استحکام کے بل پر اقبال نے اس انگریزی استعمار کے خلاف باقاعدہ جہاد کا آغاز کیا۔ لہٰذا اُن کا بیش تر کلام اس پس منظر کی یاد دلاتا ہے جو انگریزی حکومت کے دورِ غلامی میں جمود و تعطل، بے خبری اور بے عملی کا شکار بنا ہوا تھا۔ اقبال نے اسی لیے اپنی شاعری میں سب سے زیادہ زور زندہ دلی، حرکت و عمل، ہمت و جرأت بیداری اور قوت پر دیا ہے کیونکہ اُن کو یقین تھا کہ سوئی ہوئی قوم میں جنگ کی روح پھونکے بغیر غلامی کے بڑے عفریت کا مقابلہ ناممکن ہے۔ چنانچہ اقبال کی بہت سی نظمیں ہنگامی حالات کے پیشِ نظر جوشِ عمل کو ابھارنے میں سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوئیں اور قوم کے اندر نئی قوت اور نئی روح پھونکنے کے کام آئیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر نہ صرف جوش و جذبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ مردہ روح زندہ ہو جاتی ہے۔

۱۹۰۴ء میں جب ابھی آزادیٔ ہند کا ہلکا ہلکا خیال لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا اقبال نے

''تصویرِ درد'' جیسی ایک طویل نظم لکھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کا ذہن غلامی سے کس قدر بے زار اور دل آزادی کا طالب ہو رہا تھا۔ انہوں نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے کثیر مجمع کے سامنے پیش کی اور لوگوں کو آزادیٔ ہندوستان کے جذبے اور انگریزی غلامی سے نجات کی طرف متوجہ کیا۔ ''تصویرِ درد'' کے ان اشعار پر غور کیجیے:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں[۲]

اقبال مغربی سامراج کی پُرفریب چالوں سے اچھی طرح باخبر تھے اور اپنے کلام کے ذریعہ اہل وطن کو بھی باخبر رکھتے تھے۔ روس کے انقلاب ۱۹۱۷ء کے بعد اقبال کی اس ضمن میں سب سے اہم نظم ''خضرِ راہ'' تھی۔ اس نظم میں مغربی نظام حکومت کی عیاریوں کا پردہ جس سنجیدگی اور بالغ نظری کے ساتھ فاش کیا گیا ہے اس کی دوسری مثال اس عہد کی اردو شاعری میں ملنا مشکل ہے۔ اقبال نے اس نظم میں اہل فرنگ کو بُری طرح ہدفِ ملامت بنایا اور حریت کے متوالوں اور آزادی پسندوں کے خون کو گرمایا۔ اقبال نے انگریزوں کی نام نہاد جمہوریت کا راز بھی کھول کر رکھ دیا اور بتایا کہ یہ بھی ہندوستانیوں کو آزادی سے بےخبر کرنے اور مکروفریب میں پھنسانے کی ترکیبیں ہیں۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں:

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری[۳]

یوں اقبال مغرب کے پُراسرار جمہوری نظام کے چہرے سے پردہ اٹھا کر دیوِ استبداد کی ایک جھلک دکھاتے ہیں۔ پھر جمہوریت کے ان سبز باغوں میں سرمایہ ومحنت کی آویزش کا آغاز ہوتا ہے اور نغمۂ بیداریٔ جمہور بلند ہوتا ہے:

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہُوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک[۴]

''سرمایہ و محنت'' کے عنوان کے تحت ہندوستان کے غریب مزدور عوام کا خون کس طرح ایک سرمایہ دار جسے اقبال ''حیلہ گر'' کہتے ہیں، چوستا ہے، اس کا بیان بھی اس نظم کی انقلابی جہت کو نمایاں کرتا ہے۔ اقبال جس طرح غریب مزدور کو بیداری کا پیغام دیتے ہیں اس کی نظیر اردو شاعری میں ملنا مشکل ہے۔ اس دور میں انگریزی راج میں مزدور کا جس طرح استحصال ہو رہا تھا اس کی نہ صرف خوب عکاسی کی گئی ہے بلکہ انقلاب کے لیے ابھارا بھی گیا ہے:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات[۵]

درج ذیل شعر تو ایسا انقلابی ہے جس میں نہ صرف جوش و جذبہ بلکہ خوش آئند دور کا مژدہ بھی سنایا گیا ہے اگر چہ اس وقت تک ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز بھی نہیں ہوا تھا لیکن تبدیلی کی گونج ہندوستان میں سب سے پہلے اقبال کی اسی نظم میں سنائی دیتی ہے:

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے[۶]

اقبال یہ بھی جانتے تھے کہ جرأت اور قوت کی ضرب کے بغیر غلامی کی زنجیر نہیں توڑی جا سکتی یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں ہزاروں اشعار زندگی بخش اور حوصلہ انگیز ملتے ہیں۔ اقبال یہ بتاتے ہیں کہ

طاقت غلبہ کی اور کمزوری مظلومیت کی نشانی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی عوام کو قوت وعمل کا یہ سبق دیا تا کہ وہ با آسانی محکوم ومغلوب بن کر نہ رہ جائیں اور قوت وحوصلہ کی امنگ سے غلامی کے بندھن توڑ ڈالیں۔ بالِ جبریل کی نظم ''ابوالعلامعری'' اس سلسلہ کی عمدہ مثال ہے جس میں بڑے فلسفیانہ انداز اور دانش مندانہ طریقے سے قوت کا پیغام دیا گیا ہے۔ جب معری بھنا ہوا تیتر دیکھتا ہے تو تیتر سے یہ کہتا ہے:

اے مرغک بیچارہ! ذرا یہ تو بتا تُو
تیرا وہ گناہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟
افسوس، صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات [۷]

غلامی سے نجات کے لیے طاقت اور قوت ضروری ہے اس کے بغیر افراد یا اقوام آزادی حاصل نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم اقبال کی فارسی شاعری کا بھی مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اقبال آزادی اور غلامی میں کس طرح فرق کرتے ہیں اور غلامی یا غلام کی حیثیت اُن کی نظر میں کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر رضی الدین صدیقی:

انسان تو کُجا اگر جبریل کو بھی غلام بنا دیا جائے تو وہ اپنی ملکوتی صفات کھو کر عرشِ معلیٰ سے گر کر تحت الثریٰ پہنچ جائے گا...... (لہٰذا) آزاد مردوں اور غلاموں کا فرق بیان کرتے ہوئے اقبال بتاتے ہیں کہ محکوم قوموں میں نئے حقائق منکشف کرنے، نئے علوم حاصل کرنے اور نئے آلاتِ تسخیر ایجاد کرنے کا وہ ذوق وشوق نہیں پایا جاتا جو آزاد قوموں کا خاصہ ہے بلکہ محکوم صرف غیروں کی تقلید ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔[۸]

اردو شاعری میں اپنے مجموعہ کلام ضربِ کلیم میں اقبال بڑے واضح انداز میں آزاد اور محکوم کا فرق بیان کرتے ہیں:

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور

محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات[9]

یہی وجہ ہے کہ غلامی کو، خواہ وہ کسی شکل میں ہو، اقبال نوعِ انسانی کے لیے سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں اور ہر فرد بشر کو آزاد دیکھنے کے متمنی ہیں بلکہ ایسے نادان انسانوں کو جو اپنی غلامی پر مطمئن ہیں'' اقبال یہ کہہ کر جھنجھوڑتے ہیں کہ ایسے لوگ اپنی غلامی کی خصلت کے باعث کتوں سے بھی ذلیل تر ہیں کیونکہ کوئی کُتا کسی دوسرے کُتے کے آگے سر خم نہیں کرتا۔''[10]

بالِ جبریل کی مایۂ ناز نظم ''ساقی نامہ'' میں فرنگی اقتدار کے ہندوستان سے بوریا بستر لپیٹ لینے اور آزادیٔ ملک کی خوشخبری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے کی پوری خبر رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ جلد ہی سرمایہ داری کے اس دیوِ استبداد کو ہندوستان کی سرزمین سے روانہ ہونا پڑے گا۔ اسی لیے وہ بڑے تیقن اور امید افزا الفاظ کے ساتھ کہہ اٹھتے ہیں کہ:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں مہر و سلطان سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا[11]

ملوکیت اور سرمایہ پرستی اقبال کے نزدیک ظالمانہ بت تھے جن کے خلاف انہوں نے ہمیشہ آواز بلند کی۔ مزدور کی خوشحالی کی تمنائیں اور اس کی آسودگی کی خواہشیں اقبال کے دل و دماغ میں مچلتی رہیں۔ کیونکہ اقبال کو معلوم تھا کہ ہندوستان کا انقلاب کمزور، غریب اور مزدور عوام کے ہاتھوں لکھا جا چکا ہے اس لیے اقبال، لینن کی زبان سے اس خواہش کا اظہار بڑی شدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ خدا کے دربار میں فریاد تھی اور ہندوستان کی تقدیر بدلنے کی دعائیں تھیں:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات[۱۲]

اقبال کی یہ آرزو ''فرشتوں کا گیت'' اور ''فرمان خدا'' میں جوش اور ولولہ کے منتہائے عروج پر نظر آتی ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں نظمیں مزدور کی انقلابی دنیا میں ترانۂ جمہور کا درجہ رکھتی ہیں یعنی اقبال نے اس انقلابی تحریک کے قیام کا آغاز کر کے غلام ہندوستانیوں کا خون گرمانے اور انگریز سے لڑ جانے کا ہی درس نہیں دیا بلکہ غلاموں کے سینہ میں آزادی کی آگ بھی لگا دی تھی۔ مثلاً ''فرمان خدا'' کے یہ اشعار انقلاب اور آزادی کی پکار بن کر گونجنے لگتے ہیں:

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کُنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو[۱۳]

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اقبال نے اپنی شاعری میں محکوم قوم کی غیرت جگانے کے ساتھ ساتھ براہِ راست انگریزوں کی شاطرانہ چالوں پر تنقید بھی شروع کر دی۔ اُن کے اندر حریفانہ احساس بیدار ہو گیا۔ انہوں نے انگریز کی سفاک چالوں کو ابلیسی نظام تصور کیا اور ''سیاست افرنگ'' جیسی نظموں کے تحت فرنگی عیاریوں کو اہل وطن کے سامنے بے نقاب کیا۔ انگریز اور مغربی تہذیب کی مخالفت میں ایک پہلو یہ بھی چھپا تھا کہ اقبال نے دیکھا کہ ''کمزور اقوام کو غلام بنانا اور لوٹنا اس تہذیب کا شیوہ ہے اور ان اقوام کی بہت سی دولت اسی لوٹ سے حاصل ہوئی۔''[۱۴] لہٰذا اقبال انگریزوں کی اس سفا کی کو آڑے ہاتھوں لیتے رہے۔ یوں تو اقبال نے مغربی سامراج کے جبر و استحصال کے ہر پہلو کو بیان کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اپنی نظم ''مسولینی (اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)'' میں جس طرح مسولینی کی زبان سے سامراج کے تخت و تاراج کی داستان سنائی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مسولینی، یورپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جُرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زُجاج؟

آلِ سیزر چوبِ نَے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لُوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لُوٹی کشتِ دہقاں،تم نے لوٹے تخت وتاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کُشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج [۱۵]

اقبال کی ایسی شاعری کے تناظر میں جب دیکھیں تو مشہور نقاد ثاقب رزمی کی یہ رائے بہت معقول اور درست دکھائی دیتی ہے کہ:

اقبال ایشیا میں مغربی سامراج کی تاخت وتاراج اور اس کے جبر واستحصال کو دیکھ کر ایک کربِ مسلسل میں مبتلا تھا۔اس نے اس کرب کا اظہار مغربی سامراج کے خلاف مسلسل اعلانِ جہاد کی شکل میں کیا اور ایشیا کو طویل خواب گراں سے جگانے اور اسے جدوجہد پر ابھارنے کے لیے بھرپور اور مؤثر انداز میں لکھا۔اس نے مثنوی پس چہ باید کرد لکھ کر مغربی سامراج کے خلاف بڑے پیمانے پر پرچار کا آغاز کیا اور اس طرح اقوام مشرق کیلئے لحہ فکر یہ کو مجسم کر دیا۔لیکن اس کے ساتھ ہی اقبال نے یہ مژدہ بھی سنایا کہ مشرق میں ایک انقلاب ظہور پذیر ہو چکا ہے۔[۱۶]

اقبال اصل میں پسے ہوئے انسانوں کو جبر واستحصال کے مقابلے کی تلقین کرتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ سرمایہ دار زمین کا بوجھ ہے اور کھانے اور سونے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔حتیٰ کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جس تمدن کی بنیاد سرمایہ داری پر ہو وہاں انسان، انسان کا شکار کرتا ہے اور وہاں سوچ اور فکر اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔لہٰذا وہ کہتے ہیں:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے [۱۷]

دوسرے لفظوں میں ہم سرمایہ داری نظام کے خاتمے کے بغیر دانش اور تہذیب کو روبۂ عمل میں نہیں لا سکتے اور نہ ہی معاشرے کو افلاس، جہالت، بیماری اور دیگر سماجی اور اخلاقی قباحتوں کے گڑھے سے باہر نکال سکتے ہیں۔اسی لیے اقبال سرمایہ داری کے زیراثر پنپنے والے استحصالی نظام کے خلاف بھرپور جدوجہد کے حامی ہیں۔وہ حالت موجود میں انقلاب چاہتے ہیں بلکہ ایسے انقلاب کو انہوں نے امتوں کی زندگی قرار دیا

ہے۔اپنی مشہور نظم ''مسجد قرطبہ'' میں یہ شعر اسی حقیقت کو آشکار کرتا ہے:

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب[۱۸]

اسی حقیقت کے پیشِ نظر انہوں نے ہر موقع پر جدوجہد کی تلقین کی ہے۔ لاہور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا:

ابھی آپ کو ایک شدید جنگ میں قربانیاں دینی ہیں اور وہ سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف جنگ ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اس کے لیے بھی ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہیں۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یا انگریز اس کی دست گیری کرے گا تو وہ بدبخت ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ ورنہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ زندہ رہو۔[۱۹]

یہ بات بالکل واضح ہے کہ قوم کی غلامانہ ذہنیت کو دور کرنے اور اسے قعرِ غلامی سے نکالنے کے لیے اقبال نے ہمیشہ آزادی کے گیت گائے اور ان گیتوں کے مخاطب زیادہ تر محکوم اور غریب عوام ہی رہے بلاشبہ اقبال کے کلام کا مقصد غلامانہ ذہنیت کو فتح کر کے اس میں حریت پسندانہ روح پیدا کرنا ہے۔ انہوں نے غلام قوم کے احساس کمتری کو دور کر کے برتری کا احساس پیدا کیا اور یقین دلایا کہ غلام کے خون کی گرمی سے حکومت و اقتدار تو کیا ساری کائنات لرز جاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اقبال نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے عالم کو آزاد اور بے قید دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کا ثبوت ایک واقعہ سے بھی ملتا ہے، جب اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہوئے تو بمبئی میں اقبال کی ملاقات ایک یونانی سوداگر سے ہوئی جو تجارت کی غرض سے افریقہ کے ایک صوبہ ٹرانسوال جا رہا تھا جہاں کوئلے، تانبے، لوہے، سونے اور ہیرے وغیرہ کی بہت سی کانیں ہیں۔ اقبال نے جب اس سے پوچھا کہ چین میں تم کیا کام کرتے تھے تو اس نے جواب دیا سوداگری کرتا تھا لیکن چین والے ہماری چیزیں نہیں خریدتے، تو یہ سن کر اقبال کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ چینیوں نے یورپ والوں کے ساتھ عدم تعاون کا رویہ اختیار کیا ہوا ہے اور وہ اس طرح ان کو نکال باہر کریں گے۔[۲۰] شاید اسی خیال کو اقبال نے ''بالِ جبریل'' کی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' میں یوں نظم کیا ہے:

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ سے چشمے اُبلنے لگے[۲۱]

اقبال عوام کے دلوں میں ایک ولولۂ تازہ کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ اپنے وطن کے لوگوں کی سیاسی محکومی اور غلامانہ ذہنیت پر کڑھتے ہیں۔ اور حضور باری تعالیٰ میں شکایت کرتے ہیں کہ انہیں ایک

ایسے وطن میں کیوں پیدا کر دیا جس کے لوگ غیروں کی غلامی ومحکومی پر رضامند ہو گئے ہیں اور اپنی اس ذلت آمیز زندگی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ جس کے رہنما خود تو نہیں بدلتے لیکن خدائی احکامات کو بدل دینے پر ہر لمحہ تیار رہتے ہیں اور مختلف بہانے بنا کر غلاموں کو غلامانہ طور طریقوں پر چلتے رہنے کی سر توڑ کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو اس میں ہندوستان کی غلامی ومحکومی، بے بسی و بے چارگی کا گلہ یا نوحہ کتنے درد والم سے کیا گیا ہے:

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارا کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تُو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے[۲۲]

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی قوم کی اسی غلامانہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے اپنی شاعری کا رخ آزادی کی حقیقت کو بیان کرنے اور آزادی کی برکات کو آشکار کرنے کی طرف کر دیا۔ انہوں نے حریت وآزادی کے نغمے گائے اور محکوم قوم کے اندر آزادی کے جذبے کے ساتھ ساتھ آزادی کا شعور بھی بیدار کیا۔ انہیں بتایا کہ آزادی کس قدر بڑی نعمت اور غلامی کتنی بڑی لعنت ہے۔ غلامی میں قومیں کس طرح مضمحل ہو جاتی ہیں اور آزادی انہیں کس طرح شاداب اور تر وتازہ رکھتی ہے۔ جو قوم آزاد ہونا نہیں جانتی دنیا میں اس کا مقام اور مرتبہ کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنی تقدیر بنا سکتی ہیں۔ لہٰذا تو قیر احمد خان کی زبان میں:

اقبال کا پیغام پست ہمتوں کے لیے حوصلہ افزا اور جرأت آموز بنا۔ جس نے ہندوستان کی آزادی میں سب سے اول اور سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اقبال کا کام ہندوستان کی آزادی تک ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اُن کا آفاقی پیغام سارے عالم کے لیے ایک پیغام ہے جو دنیا کے ہر گوشے کے محکوم ومظلوم کے لیے نوید حیرت اور پیامِ حیات ہے، جس سے ساری دنیا کے غریب مزدور ہمیشہ تازگی، فرحت، امید اور حوصلہ حاصل کرتے رہیں گے اور اقبال کے انقلابی خیالات ہر غلام ملک اور غلام قوم کے لیے حریت وآزادی کا مژدہ جاں فزا سناتے رہیں گے۔[۲۳]

اقبال نے اپنی قوم کو انقلاب اور آزادی کا نعرہ دے کر ایسا احسانِ عظیم کیا ہے جس کا بدل شاید کبھی نہ چکایا جا سکے گا۔

❁...❁...❁

حوالہ جات وحواشی

۱۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، موضوعاتِ فکرِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء، ص ۳۸۔
۲۔ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۰۔
۳۔ ایضاً، ص ۲۸۹ تا ۲۹۰۔
۴۔ ایضاً، ص ۲۹۲۔
۵۔ ایضاً، ص ۲۹۱ تا ۲۹۲۔
۶۔ ایضاً، ص ۲۹۲۔
۷۔ ایضاً، ص ۴۸۷۔
۸۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصورِ زمان و مکان اور دوسرے مضامین، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء، ص ۱۵۶۔
۹۔ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۹۱۔
۱۰۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصورِ زمان و مکان اور دوسرے مضامین، ص: ۱۶۱۔
۱۱۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۴۵۰۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۴۳۶۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۴۳۷۔
۱۴۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۷۔
۱۵۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۶۶۱ -۶۶۲۔
۱۶۔ ثاقب رزمی، اقبال ایک نیا مطالعہ، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۶۱۔
۱۷۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۵۱۵۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۴۲۸۔
۱۹۔ بحوالہ ثاقب رزمی، اقبال کی انقلابیت، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء، ص ۹۷
۲۰۔ بحوالہ توقیر احمد خان، احتجاج کی منفرد آواز: اقبال، مشمولہ احتجاج اور مزاحمت کے رویے، مرتبہ: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، دہلی، اردو اکادمی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۲۔
۲۱۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۴۵۱۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۲۷۔
۲۳۔ توقیر احمد خان، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، ص ۱۱۸۔